itsurdu.blogspot.com

ماں جی ..... روشانے سجین

تنہائی زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے۔نفسانفسی کے اس دور میں جہاں لوگوں کے پاس ہمیشہ وقت کی قلت رہتی ہے، وہاں اپنوں کا ساتھ انسان کی خواہش سے زیادہ اس کی ضرورت ہے۔روح کی تشنگیاں مٹانے کے لیے اپنوں کی محبت اور توجہ کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ قدرتی تقاضوں کے عین مطابق ہے ورنہ تنہائیوں کے سلگتے ساون میں انسان اندر ہی اندر جھلستا رہتا ہے۔بستی دل میں خزاں رتوں کے موسم ٹھہر جائیں تو انسان زندہ رہتے ہیں، مگر دل مر جاتے ہیں اور دل مر جائیں تو شہر تمنا کے چراغاں سے خوشی حاصل نہیں ہوتی۔

لوگ ہمیشہ اپنی ذات کے شہر میں گم رہتے ہیں۔اردگرد کے انسانوں سے بے نیاز..... دوسروں کے جذبات و احساسات کو نظر انداز کر کے اپنی خواہشات کو مقدم رکھنا ایک وتیرہ بن چکا ہے۔کیوں کہ ہم ہمیشہ اپنے مفادات اور اپنی ترجیحات کو ہی مقدم رکھتے ہیں، یہ جانے بنا، یہ محسوس کیے بغیر کہ ہمارا یہ فعل دوسروں کے لیے تکلیف کا باعث بن سکتا ہے..... کبھی کبھی لگتا ہے کہ انسان فطری طور پر خود غرض ہے۔خود غرضی اور خود پسندی اگر آج کے زمانے کا چلن ہے تو ایسا کیوں؟.....

خود غرضی اور خود پسندی Materialism کو جنم دیتی ہے اور اس کا اندازہ مجھے ''ماں جی'' کو دیکھنے کے بعد ہوا، وہ ایک اداس سی شام تھی۔سرمئی بادلوں کی ٹکڑیاں نیلگوں گگن پر یوں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں، جیسے پورے آکاش کو اپنی سندر بانہوں میں لپیٹنے کو بے قرار ہوں۔

غروب آفتاب کا وقت، سرخ بنفشی گولہ دھیرے دھیرے مغرب کی گود میں چھپ رہا تھا۔ڈوبتے سورج کو دیکھ کر مجھے لگا جیسے پوری کائنات بھی اس کے ساتھ ہولے ہولے ڈوب رہی ہو۔

سنگل بنچ پر بیٹھا وہ نحیف و نزار سا وجود بھی اس اداس سلونی شام کا ایک حصہ ہی لگ رہا تھا۔پارک میں اکا دکا لوگ ہی تھے۔وہ فضا میں کسی غیر مرئی نقطے کو گھورتے ہوئے اپنے آپ سے بے نیاز جانے کس دنیا میں کھوئی ہوئی تھیں۔ان کا یہ کھویا کھویا سا انداز مجھے ان کی طرف متوجہ کر گیا اور میں مخملیں گھاس کے قالین سے اٹھ کر ان کے قریب جا بیٹھی، ان کے وجود میں ہلکی سی حرکت ہوئی اور انہوں نے ذرا سا رخ موڑ کے میری طرف دیکھا، ان کی آنکھوں میں حزن و ملال کا ایک سمندر موجزن تھا۔

ان کے کھنڈر سے زرد چہرے پر عجیب سی ویرانی اور کرب نمایاں تھا۔مغموم چہرے اور متورم آنکھوں میں جانے کیسی کشش تھی کہ میں بے اختیار انہیں مخاطب کر بیٹھی۔

''ماں جی! آپ ہر روز یہاں آتی ہیں؟'' میں نے بات چیت کا بہانہ ڈھونڈا۔

''نہیں بیٹی..... کبھی کبھار آتی ہوں۔'' انہوں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔پھر میں خاموش ہو گئی۔سمجھ میں نہ آیا کہ گفتگو کو آگے کیسے بڑھاؤں، سو خاموشی سے سر جھکا لیا۔وہ بھی مزید کچھ کہے بغیر وہاں سے اٹھ گئیں۔

اگلے دن چہل قدمی کی غرض سے گھر کے نزدیک واقع اسی پارک میں دوبارہ جانا ہوا تو وہ پھر مجھے اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھی دکھائی دیں، میں ان کی طرف بڑھی اور انہیں سلام کیا۔مجھے دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک لہرائی اور انہوں نے مجھے اپنے پاس بیٹھنے کو کہا۔

آج انہوں نے سفید اجلا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ہاتھ میں تسبیح پکڑے دوپٹے کو نماز کے اسٹائل میں لپیٹے وہ بہت سادہ اور معصوم لگ رہی تھیں۔کل کی نسبت آج ان کے چہرے پر اداسی کی کیفیت قدرے کم تھی البتہ آنکھوں کی سوگواریت ہنوز قائم تھی۔

''کیسی ہو بیٹی؟'' نہ کوئی جان نہ پہچان، بس ایک غیر مبہم سی ملاقات، پھر بھی ان کا یوں محبت سے مستفسر ہونا ان کی سادگی اور اچھی فطرت کا ثبوت تھا۔

میں ان کے قریب بیٹھ گئی اور ہم ہلکی پھلکی گفتگو کرنے لگے۔وہ مجھ سے انتہائی میٹھے اور شہد آمیز لہجے میں بات کر رہی تھیں۔یوں لگ رہا تھا جیسے وہ شدید تنہائی اور اکیلے پن کا شکار ہوں۔دوران گفتگو وہ بار بار میرے چہرے کی طرف دیکھتیں، ان کے چہرے پر ممتا کا گداز پن اور آنکھوں میں اتنی تڑپ تھی کہ میں ان کی پیاسی نگاہوں کی تاب نہ لا سکی اور بے اختیار نظریں چرا گئی۔

دفعتاً انہوں نے میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں تھاما اور میری پیشانی چوم لی، گویا انہوں نے اپنی ممتا کی تسکین کی، جانے کس جذبے کے زیر اثر میری آنکھیں جھلملا گئیں۔مجھے لگا ان کے پرنور وجود سے جیسے روشنیاں سی پھوٹ رہی ہوں۔اسی پل وہ مجھے کسی اور ہی دنیا کی باسی لگیں۔سفید اجلا لباس، ہاتھ میں تسبیح، پرنور ملیح چہرہ جیسے کوئی مقدس فرشتہ۔

''اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔'' ڈبڈباتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے انہوں نے دعا دی اور تھکے تھکے قدموں سے اٹھ کر چلی گئیں۔

اب تو یہ میرا روز کا معمول بن گیا، چہل قدمی کے لیے ہر شام پارک جانا اور ان سے ڈھیروں باتیں کرنا۔وہ بھی اب میری منتظر رہنے لگیں۔مجھے دیکھتے ہی ان کے چہرے پر ممتا کی الوہی چمک بکھرنے لگتی۔گویا میرا ان کے ساتھ کوئی بہت گہرا رشتہ ہو۔

ان کی اداسی کی کیفیت پہلے کی نسبت قدرے کم تھی البتہ آنکھوں کا کرب چھپائے نہ چھپتا لیکن پھر ایک دن خلاف معمول وہ بہت خوش دکھائی دے رہی تھیں۔

میں نے ان سے اس بارے میں استفسار کیا تو بتانے لگیں کہ آج میرا بیٹا اور بہو اپنے بچوں سمیت مجھ سے ملنے کے لیے آئے ہوئے ہیں..... ماں جی کبھی اپنے بارے میں اتنا کھل کر بات نہیں کرتی تھیں، کریدنے کی عادت مجھے بھی نہیں ہے۔سو میں ان کے حالات زندگی کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتی تھی، لیکن اس دن خلاف عادت وہ اپنے بارے میں سب بتاتی چلی گئیں.....

شاید وہ سلجھانے کے موڈ میں تھیں۔وہ جوانی میں ہی بیوہ ہو گئیں۔ان کے شوہر ایک ٹریفک حادثے میں جاں بحق ہو گئے تھے۔وہ ایک ورکشاپ میں معمولی سے موٹر مکینک تھے اور یہ لوگ ڈھائی مرلے کے چھوٹے سے گھر میں رہائش پذیر تھے۔شوہر کی وفات کے بعد ماں جی نے حالات کا مقابلہ بڑی بہادری سے کیا اور اپنے بچوں کو دینی و دنیاوی تعلیم سے آراستہ کیا۔

وہ گورنمنٹ اسکول کی ٹیچر تھیں اور شام میں بچوں کو گھر میں ٹیوشن بھی پڑھاتی تھیں۔ان کے تین بیٹے تھے جو باپ کی وفات کے وقت بہت کم سن تھے۔کئی لوگوں نے ماں جی کو دوسری شادی کا مشورہ دیا لیکن انہوں نے کسی کی ایک نہ سنی اور دن رات محنت کر کے اپنے بچوں کو پروان چڑھایا۔

''اللہ کا شکر ہے۔اس ذات پاک کا بڑا احسان ہے کہ اس نے مجھے میرے مقصد میں سرخرو کر دیا۔آج میرے تینوں بیٹے پڑھ لکھ کر اونچے مقام پر ہیں۔'' ان کے لہجے میں ممتا کا تفاخر تھا۔

''وہ تینوں زندگی کی دوڑ میں بہت آگے ہیں، اتنے آگے کہ ان سے ان کی ماں بھی پیچھے چھوٹ گئی ہے۔'' وہ ایک دم مضطرب ہو گئیں۔

''ماں جی کرتے کیا ہیں آپ کے بیٹے؟'' میں نے یوں ہی برسبیل تذکرہ پوچھا۔

''سب سے بڑا فوج میں ڈاکٹر کیپٹن ہے اور اسلام آباد میں رہتا ہے..... دوسرا ماشاءاللہ انگریزی کا لیکچرار ہے۔یہیں فیصل آباد میں ہی رہتا ہے اور تیسرا دبئی میں ہوتا ہے۔بڑی اچھی نوکری ہے اس کی ایم بی اے کر رکھا ہے اس نے۔خیر سے تینوں شادی شدہ ہیں۔'' اپنے بچوں کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں ایک خاص طرح کی چمک تھی۔

''مگر! آپ اکیلی کیوں رہتی ہیں؟''..... معاً میں نے استفہام کیا.....

''بس ایسے ہی۔'' وہ پھیکی سی ہنسی ہنسیں۔

''دو تو ویسے ہی دور ہیں..... سال میں ایک آدھ بار ملنے آ جاتے ہیں، ایک ادھر فیصل آباد میں ہی ہے۔پر وہ لوگ اس چھوٹے سے گھر میں کیسے رہ سکتے ہیں۔'' انہوں نے گویا اپنے بچوں کی لاپرواہی پر پردہ ڈالا۔

''تو آپ ان کے پاس چلی جائیں ماں''.....

''نہیں بیٹا! ان کی بیویوں کو لگتا ہے کہ اماں کے آنے سے ہماری روٹین ڈسٹرب ہو جاتی ہے۔پھر خواہ مخواہ کی روک ٹوک سے بچے بھی اپ سیٹ ہو جاتے ہیں۔تم تو جانتی ہو ہم پرانے لوگ کسی نہ کسی بات پر بچوں کو سرزنش کر ہی دیتے ہیں۔'' وہ سارا الزام خود پر لے رہی تھیں۔

''اسی لیے میں ان کی طرف کم ہی جاتی ہوں۔'' وہ پھر سے اسی کھوئے کھوئے انداز میں بولیں جس میں میں نے انہیں پہلے دن دیکھا تھا۔

مجھے ان کی باتیں سن کر حقیقتاً افسوس ہوا۔

''جو فیصل آباد میں ہی رہتے ہیں، وہ آپ سے کتنے دنوں بعد ملنے آتے ہیں؟'' میں نے ان کی تنہائی اور بے چارگی کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہی کوئی چھ سات ماہ بعد..... کبھی کبھار بچوں اور بہو کو بھی لے آتا ہے۔''

''ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے..... اتنے دنوں بعد.....'' میں غصے سے چیخ ہی تو اٹھی۔

''بیٹی! دراصل میرا گھر جس گلی میں ہے وہ بہت تنگ ہے، اس بے چارے کی گاڑی وہاں تک نہیں آتی۔اتنی لمبی تو گاڑی ہے اس کی..... گھر تک آتے آتے جھنجلا جاتے ہیں وہ سب، کہتے ہیں، اماں آپ کا گھر کتنی تنگ جگہ پر ہے..... سچ ہی تو کہتے ہیں بے چارے''..... وہ مجھ سے نظریں چراتے ہوئے بولیں۔

میرا دل چاہا کہ اس ماں کی عظمت کو سلام کروں جس نے اپنے بچوں کو اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر ایک اعلیٰ مقام تک پہنچایا اور پھر جب وہ کسی قابل ہو گئے تو اپنی ماں کی محنت اور قربانیوں تک کو بھول گئے۔آج بھی وہ ماں ان کی غفلت و لاپرواہی کا کوئی شکوہ کوئی گلہ نہیں کر رہی تھی..... اب مزید کوئی سوال نہ کرنا ورنہ میں اپنا بھرم نہیں رکھ سکوں گی..... دو بوڑھی آنکھوں نے خاموش التجا کی اور میں زبان کی نوک پر مچلتے بے شمار سوالوں کو دل میں دبا گئی کہ وہ خود دار عورت اپنی مجبوریوں کا اگر بھرم رکھنا چاہتی ہے تو مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میں ان کی اولاد کی کوتاہیاں ان کے سامنے لا کر انہیں اور ان کی پرورش کو شرمسار کروں، سو میں نے خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی۔

وہ بھی ملول چہرے کے ساتھ خاموشی سے اٹھ کر چلی گئیں..... اور میں دل پر ڈھیروں بوجھ لیے گھر واپس آ گئی..... والدین ہمیں انگلی پکڑ کر قدم قدم چلنا سکھاتے ہیں اور جب ہم کسی قابل ہو جاتے ہیں تو انہیں ہی بھول جاتے ہیں۔اپنے آشیانے کو بھول کر کھلے آسمانوں کی رفعتوں میں کھو جاتے ہیں۔

کیا بوڑھے ماں باپ بوجھ ہیں؟ اگر ایسا ہے تو اس معاشرے کو، اس کی اخلاقی و روحانی اقدار کو، فیملی سسٹم کو تباہ ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

اے اہل فکر! غور کیجیے کہ اگر آج ہم نے اپنے رشتوں کو عزت دینا نہیں سیکھی..... بزرگوں کو مان سمان نہیں دیا، تو بہت جلد ہم اپنی پہچان، اپنا اصل کھو بیٹھیں گے۔

اگر فرد واحد بھی یہ انداز فکر اپنا لے کہ ہمیں اپنی معاشرتی و اخلاقی اور مذہبی اقدار کی پاسداری کرنی ہے۔خود کو پہچان دینی ہے..... اپنوں سے..... اپنے رشتوں سے..... تو اس خاموش تباہی کو روکا جا سکتا ہے۔

ذات سے ہستی تک کا سفر خود کی پہچان دیتا ہے۔شہر ذات میں انقلاب لے آتا ہے، لہٰذا ہر شخصی انقلاب سے معاشرتی انقلاب تک کا وقت دور نہیں ہوگا.....

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com